مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی یاد میں

(دوسری اور آخری قسط)

خورشید احمد

برصغیر کی حد تک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی دونوں اپنے اپنے طور پر ایک مشترک فکر اور منہج تک پہنچے اور پھر دونوں نے مل کر اس تصور دین کی بنیاد پر ایک فکری اور اجتماعی تحریک کی آبیاری اور قیادت کی۔ جماعت اسلامی کی انقلابی دعوت اور ساری دنیا میں اسلامی احیا کی تحریکوں کا یہی پیغام ہے۔

چند اختلافی امور کی وجہ سے ۱۹۵۸ میں جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد بھی مولانا اصلاحی نے اسی فکر اور اسی منہج کی ترویج کے لیے اپنی زندگی وقف کی اور آخری لمحہ تک اس کی شہادت دیتے رہے۔ جماعت سے ان کا استعفا ایک سانحہ تھا اور مولانا اصلاحی نے ان امور کا بھی برملا اظہار کر دیا ہے جن کی وجہ سے وہ جماعت سے مستعفی ہوئے' نیز دوسرے موقف کے بارے میں بھی مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے لٹریچر میں تمام ضروری پہلو آگئے ہیں اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس وقت نہ ان کا اعادہ مقصود ہے نہ محاکمہ۔ البتہ اس حقیقت کی نشاندہی مطلوب ہے کہ ان اختلافات کا تعلق تصور دین اور تحریک کے بنیادی پیغام اور طریق کار سے نہ تھا۔ ۱۹۵۶ سے ۱۹۵۸ تک کے فیصلہ کن دور میں' میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں سے بہت قریب تھا۔ یہ دونوں بزرگ اپنی شفقت میں ایک خورد سے ساتھی اور رفیق کی طرح معاملہ کرتے تھے۔ ماچھی گوٹھ کے اجتماع اور مئی ۱۹۵۷ کی کوٹ شیر سنگھ کی شوریٰ میں مجھے ایک قابل لحاظ کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ چودھری غلام محمد صاحب کے ساتھ میں تقریباً تمام ہی اہم ملاقاتوں میں شریک رہا۔

ماچھی گوٹھ میں جب مسائل کے حل اور امیر جماعت اور شوریٰ کے اختلافات کے درمیان نقطہ اعتدال و اتفاق تلاش کرنے کے لیے ایک مجلس مشاورت منتخب ہوئی تو دونوں بزرگوں نے کمال عنایت سے مجھے اس مجلس کا سب سے نوعمر رکن ہونے کے باوجود اس کا صدر مقرر کیا۔ جو قرارداد یں پالیسی اور پھر مستقبل کے

جماعت کے دستوری نظام کے بارے میں طے ہوئیں ان کو مرکزی شوریٰ اور اس مجلس مشاورت کے درمیان اتفاق رائے سے تیار کیا گیا تھا۔ مجھے یہ نازک ذمہ داری ادا کرنی پڑی کہ شوریٰ کے ارکان اور خصوصیت سے مولانا امین احسن اصلاحی اور پھر مولانا مودودی اور اس مجلس مشاورت' جسے مولانا مودودی نے اعتماد میں لے کر اپنی مشکلات سے آگاہ کیا تھا' کے درمیان شٹل کاک (پیغام رساں) کا رول ادا کروں تاکہ سب کے مشورے سے کوئی متفق علیہ لائحہ عمل مرتب کیا جا سکے۔

آج اس حقیقت کو بھی ریکارڈ پر لاتا ہوں کہ اس پورے عمل میں دونوں کے مشورے سے اور دونوں کے اعتماد کے ایک اور بزرگ نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا اور وہ تھے مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم۔ وہ اس پورے عرصے ماچھی گوٹھ ہی کے ایک کمرے میں مقیم رہے' ہم سب بار بار ان سے مشورہ کرتے تھے اور وہ اتفاق کی راہیں نکالنے میں مدد دیتے تھے۔ دوسرے اختلاف کرنے والوں کی بات مختلف ہے--- اور شیخ سلطان احمد صاحب' حکیم محمد اشرف صاحب' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور ارشاد احمد حقانی صاحب' ہر ایک کا اپنا اپنا نقطہ نظر تھا اور شکایت کی وجوہ بھی۔ لیکن مولانا اصلاحی کی حد تک میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں وہ کم از کم اس وقت فی نفسہ جماعت کی جانب سے قومی انتخابی عمل میں شرکت کے مخالف نہ تھے۔

مولانا اصلاحی کا صرف یہ اصرار تھا کہ مناسب تیاری کے لیے وقت درکار ہے اور ابھی زمین اتنی تیار نہیں ہے کہ اس عمل کے ذریعے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ اس لیے مسئلہ صرف یہ نہیں کہ انتخاب میں حصہ بلاواسطہ لیا جائے یا بالواسطہ' بلکہ یہ کہ کب حصہ لیا جائے اور کب تک نہ لیا جائے۔ بالآخر ہمارے درمیان جس آخری مسودے پر اتفاق ہوا تھا' اس میں ایک جزوی ترمیم کا' جو اجتماع ارکان میں پیش کیے جانے کے بعد کی گئی انھیں افسوس تھا۔ یہ قرارداد ۱۵ کے مقابلے میں ۹۲۰ ارکان کی تائید سے منظور ہوئی۔

رہا دوسرا مسئلہ یعنی امیر اور شوریٰ کے تعلق کا' تو اسے کم از کم مستقبل کے لیے باہم مشورے سے طے کر لیا گیا تھا اور جو حضرات شوریٰ سے ان کے واک آؤٹ کرنے کی بات کرتے ہیں' وہ حقائق کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔ شوریٰ والا مسئلہ بالکل نیا نہیں تھا۔ جماعت کا جو دستور تاسیس کے وقت بنایا گیا تھا اس میں شوریٰ کے بارے میں کوئی بات نہیں تھی۔ جب کام آگے بڑھا تو شوریٰ کی ضرورت محسوس ہوئی اور شوریٰ قائم بھی ہو گئی۔ لیکن آیا شوریٰ کا فیصلہ حتمی ہو گا یا امیر کو ویٹو کا حق حاصل ہے' اس پر مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے درمیان اصولی اختلاف تھا۔ مولانا مودودی نے اسلام کا سیاسی نظریہ میں بھی امیر کے ویٹو کی بات کی ہے اور بعد میں جماعت کے دستور میں تدبیر کے معاملات اور شرعی رائے میں فرق کیا گیا۔ اول الذکر میں شوریٰ کو اور ثانی الذکر میں امیر کو فوقیت دی گئی۔ نیز اگر اول الذکر کے سلسلے میں اختلاف ناقابل سمجھوتہ ہو تو ارکان سے استصواب اور جس کے حق میں ارکان کا استصواب ہو اس کے مخالف رائے والے کے استعفے

کی شق (provision) رکھی گئی۔ یہ تمام ترمیمات دونوں بزرگوں کے اتفاق رائے سے ہوئیں۔

اس پس منظر میں ماچھی گوٹھ اور کوٹ شیر سنگھ میں منعقد ہونے والی شوریٰ میں اس امر پر اتفاق رائے ہوا کہ جماعت چلانے کی آخری ذمہ داری امیر جماعت کی ہوگی' پالیسی سازی شوریٰ کرے گی اور اس کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ البتہ امیر کو اگر بہت بنیادی اعتراض ہو تو شوریٰ مابعد تک فیصلہ کو موخر کرا سکتا ہے' اور مابعد کی شوریٰ کا فیصلہ سب کے لیے حتمی ہوگا۔ یہ تمام باتیں گھنٹوں اور دنوں مشاورت کے بعد طے ہوئیں اور ماچھی گوٹھ کی قرارداد اور ۱۹۵۷ کے دستور میں موجود ہیں۔ ان تمام امور پر مولانا اصلاحی کا مکمل اتفاق تھا۔ دستور مولانا کی موجودگی میں منظور ہوا اور صرف ایک شق ۳۴ (۶) پر جس کا تعلق عاملہ کے اختیارات سے تھا' اختلاف ہوا۔ بلاشبہ مولانا اصلاحی نے ۱۹۵۶ کی شوریٰ کے چار ارکان سے استعفیٰ طلب کرنے کے مسئلے پر مولانا مودودی سے سخت اختلاف کیا تھا جو اس زمانے کی خط و کتابت میں موجود ہے--- لیکن مستقبل کے لیے اور پھر ۱۹۵۷ کے دستور کی تسوید کے موقع پر امیر اور شوریٰ کے اختیارات کے سلسلے میں تمام فیصلے باہم رضامندی اور اتفاق رائے سے ہوئے' البتہ باہمی اعتماد کو جو ٹھیس لگ گئی تھی بالآخر جدائی کا سبب بنی۔

جہاں تک معاملہ علمی اختلافات کا ہے تو وہ پہلے بھی رہے ہیں۔ اگر ترجمان القرآن کی فائلوں کا مطالعہ کریں تو پردہ کے مسئلے پر دونوں کے درمیان اختلاف مطبوعہ مضامین میں موجود ہے۔ پھر مسلم قومیت اور اسلامی قومیت کے مسئلے پر صرف غلط فہمی کی بنیاد پر تشکیل جماعت سے پہلے اختلاف رونما ہوا جو الاصلاح میں موجود ہے۔ بعد میں حکمت عملی اور قریشیت کے مسئلے پر بھی اختلاف ہوا اور حدیث سے متعلق چند تفصیلی پہلوؤں اور رجم وغیرہ کے بارے میں بھی دونوں کے نقطہ نظر میں نمایاں فرق ہے۔ لیکن ان سب کی حیثیت علمی آرا میں اختلاف کی ہے جو ہمارے علما کی زرین روایت کا حصہ ہے اور جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ؏

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن

میں نے اس وقت ان اختلافی امور کا ذکر جس وجہ سے کیا ہے وہ صرف ریکارڈ درست کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اس حقیقت کا اظہار کرنے کے لیے ہے کہ ایسے اختلافات کے باوجود اور ایک مختصر عرصے میں خطوط کے قلمی مباحثے کے علی الرغم دونوں بزرگوں میں اور جماعت اسلامی اور مولانا اصلاحی کے درمیان اعتماد اور قدر دانی کا رشتہ موجود رہا۔ جماعت اسلامی کے کارکن مولانا اصلاحی کے لٹریچر سے پہلے کی طرح استفادہ کرتے رہے اور وہ ان کے علمی اور تربیتی نصاب کا حصہ رہا اور ہے' جس طرح مولانا اصلاحی کے اجتماعی دور میں تھا۔ اور مولانا اصلاحی جماعت چھوڑنے کے بعد بھی اسی بنیادی فکر کی ترقی اور ترویج کے لیے سرگرم عمل رہے اور تدبر قرآن' تزکیہ نفس' دعوت دین اور اس کا طریق کار' اسلامی ریاست' تفہیم

دین' اسلامی قانون کی تدوین' اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' فلسفہ کے بنیادی مسائل' قرآن حکیم کی روشنی میں' مبادی تدبر حدیث' مبادی تدبر قرآن جیسی قیمتی کتب' کچھ نئی اور کچھ نظرثانی اور اضافوں کے ساتھ' طالبان حق کے لیے رشد و ہدایت کا سامان فراہم کرنے کا ذریعہ رہیں۔ جماعت کی قیادت میں مولانا اصلاحی کا احترام اور ان سے استفادے کا شوق اسی طرح رہا اور مولانا اصلاحی نے جماعت کو چھوڑنے کے بعد بھی اس کو اپنی ہی جماعت سمجھا اور تنقید و احتساب کے علی الرغم اپنا سمجھا۔

۱۹۸۶ میں جناب مصطفیٰ صادق صاحب سے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

میں جماعت اسلامی کو اپنی جماعت کہتا ہوں۔ میں سترہ سال اس کے ساتھ رہا ہوں۔ آج بھی آپ سے سچ کہتا ہوں کہ ان کی فتح کو اپنی فتح اور ان کی شکست کو اپنی شکست سمجھتا ہوں۔ یہی ایک جماعت تھی جس سے آپ احقاق حق اور ابطال باطل کی توقع کر سکتے تھے اور امید بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں۔ (وفاق اور تکبیر' جلد ۸' شمارہ ۲' ۲۹ مئی ۱۹۸۶)

مولانا اصلاحی ۱۹۵۸ میں جماعت سے مستعفی ہوئے۔ ۱۹۶۸ تک جب میں انگلستان منتقل ہوا' ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ حسب سابق شفقت اور رہنمائی فرماتے رہے۔ میں نے اور چودھری غلام محمد صاحب نے ایس ایم کالج کراچی میں اسلامی قانون کی تدوین پر ان کے لیکچرز کا اہتمام کیا اور انھوں نے کمال شفقت سے یہ لیکچرز دیے۔ ان میں سے دو ماہنامہ چراغ راہ کراچی کے اسلامی قانون نمبر میں شائع ہوئے۔ ۱۹۶۴ میں جماعت پر پابندی لگی اور ہم سب گرفتار ہوئے تو مولانا اصلاحی بے چین ہو گئے۔ وہ اسی طرح مضطرب رہے جس طرح جماعتی دور میں ہوا کرتے تھے۔

ستمبر ۱۹۷۹ میں مولانا مودودی کا انتقال ہوا تو منصورہ تشریف لائے۔ میں مولانا مودودی کے جسد خاکی کے ہمراہ آیا تھا اس لیے اشکبار آنکھوں کے ساتھ مجھ سے کرید کرید کر سوالات کرتے رہے۔ کئی بار فرمایا "آج میرا یار چلا گیا"۔ صحافیوں نے مولانا مودودی کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ "ان کے مقام کو آپ کیا جانیں۔ ایک مزاج شناس رسول جدا ہو گیا"۔ مجھ سے ہی نہیں متعدد افراد سے فرمایا: "آپ لوگوں کو کیا معلوم کہ مودودی کیسا انسان تھا۔ اب ایسے لوگ کہاں۔ ان سے تو اتفاق کرنے میں بھی مزہ تھا اور ان سے اختلاف کرنے میں بھی لطف آتا تھا"۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چودھری غلام محمد صاحب اور میں جب انھیں جماعت میں رکھنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے تو کس طرح بار بار انھوں نے جماعت ہی سے نہیں مولانا مودودی سے بھی اپنے قلبی تعلق کا ذکر کیا اور اپنے مخصوص انداز میں شوریٰ کے اجلاسوں کا ذکر کیا۔

ایک موقع پر چودھری غلام محمد صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے دور کے شوریٰ کے کچھ ارکان کے اظہار خیال کے انداز کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا:

"کچھ لوگ میری طرح جرات اور بے باکی سے، کچھ باقر خاں کی طرح ڈپلومیسی اور ہوشیاری سے، کچھ وصی مظہر کی طرح دستوری اور قانونی نکتہ سنجی کی شکل میں، کچھ ملک صاحب (ملک نصراللہ خاں عزیز) کی طرح کبھی حکمت سے اور کبھی ظرافت سے، کچھ عبدالجبار غازی کی طرح صفائی اور بردباری سے اور کچھ آپ (چودھری غلام محمد صاحب) کی طرح ادب اور نیاز مندی سے اپنی بات کہتے تھے"۔

یہاں مولانا اصلاحی نے دو دو لفظوں میں ہر شخص کی پوری شخصیت اور اس کے انداز کلام کا جوہر بیان کر دیا ہے، جس سے ان کی انسان شناسی اور شوخی بیان دونوں کا پتا چلتا ہے۔

مولانا اصلاحی کے الاصلاح کے دور کے ساتھی گواہی دیتے ہیں کہ جس زمانے میں ان کا قومیت کے مسئلے پر مولانا مودودی سے اختلاف چل رہا تھا تو اس وقت بھی وہ نہ صرف یہ کہ مولانا مودودی کی بے حد عزت کرتے تھے بلکہ لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ ان کی تصانیف کا مطالعہ کریں کیونکہ ان کی نگاہ میں اسلام پر ان سے بہتر لٹریچر اس دور میں کسی نے نہیں لکھا۔ نیز بقول ان کے ایک شاگرد، اصلاحی صاحب نے فرمایا "اگر اسلام کو سمجھنا چاہتے ہو تو مودودی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ اگر دین کی کچھ قلمی خدمت کرنا چاہتے ہو تو ان کے داعیانہ طرز تحریر کو اپناؤ"۔ یہی رویہ ان کا آخر دم تک رہا۔ اسی طرح مولانا مودودی، مولانا اصلاحی کے علمی مقام اور فہم قرآن کے باب میں ان کی خدمات کے بے حد مداح تھے اور ان کے افکار اور ان کی کتب سے استفادہ کا مشورہ دیتے تھے اور ان کا ذکر آخیر وقت تک عزت اور محبت سے کرتے رہے۔ یہاں یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ جب ۱۹۵۳ میں مولانا مودودی کو سزائے موت دی گئی ہے اور ان کو جیل کے اس حصہ میں منتقل کیا گیا ہے جو پھانسی کی کوٹھڑی (death cell) کہلاتا ہے تو مولانا اصلاحی کی کیفیت دیکھنے کے لائق تھی۔ جب مولانا مودودی کے کپڑے "پھانسی کی کوٹھڑی" سے بھیجے گئے ہیں اور ان کو سزائے موت کے "مجرموں" کے کپڑے پہنائے گئے ہیں تو مولانا اصلاحی نہ صرف اشکبار ہو گئے بلکہ ایک لمحے کے لیے ان کپڑوں کو چوم لیا۔ جب میں نے بعد میں مولانا اصلاحی سے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا تو بڑی پیاری بات کہی۔ فرمایا: خورشید میاں! یہ فقہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ جب مجھے مودودی صاحب کے لیے سزائے موت کی اطلاع ملی ہے تو میں چونک پڑا اور دل نے کہا سبحان اللہ! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مودودی کا مقام اتنا بلند ہوتا ہے کہ وہ کلمہ حق کہنے پر سولی پر چڑھایا جائے گا۔ پھر دل نے کہا کہ مودودی کو یہ لوگ پھانسی نہیں دے سکتے۔ اگر کہیں ایسا ہو جاتا تو نہ معلوم اس قوم پر کیسا عذاب نازل ہوتا۔

یہ صحیح ہے کہ چند سیاسی اختلافات کی بنا پر مولانا اصلاحی نے جماعت سے رکنیت کا رشتہ منقطع کر دیا تھا مگر ان کی ساری زندگی اسی مقصد کے لیے علمی، دعوتی اور تعلیمی کام کرتے گزری اور اس طرح جوہری اعتبار سے وہ اسلامی تحریک ہی کی خدمت میں ساری زندگی مصروف رہے۔ شاید اللہ تعالیٰ کو اسی رمز کا شعور دلانا

مطلوب تھا کہ مولانا اصلاحی کے ورثا کی خواہش پر ان کی نماز جنازہ محترم قاضی حسین احمد امیر جماعت اسلامی نے پڑھائی اور جماعت کے قائدین اور کارکنوں نے اپنے کو دوسری بار یتیم ہوتے محسوس کیا۔

اس پورے معاملے میں امت کی علمی اور تہذیبی روایت کی ایک اور نشانی بھی دیکھی جاسکتی ہے جس کا ذکر اقبال نے بھی بڑی بصیرت سے کیا ہے یعنی علما اور فقہا کے درمیان اختلافات جن کا اظہار کبھی شدید ترین انداز میں بھی ہوا' لیکن اس کے ساتھ ایک دوسرے کا احترام اور اپنے شاگردوں کو انھی علما اور اساتذہ سے استفادے کی ترغیب جن سے اختلاف کیا جاتا تھا۔ بدقسمتی سے امت کے زوال کے ادوار میں یہ روایت ختم ہو گئی لیکن ہمارے اپنے دور میں ان دونوں بزرگوں کے تعامل نے اعتدال' رواداری' ایک دوسرے کے اعتراف اور مخلصانہ تعلق خاطر کی اس شاندار روایت کو ایک بار پھر تازہ کر دیا--- اللہ کی رحمتیں ہوں ان سعید روحوں پر!

مولانا کے علمی مقام اور تحریکی خدمات پر تو بہت کچھ لکھا جائے گا اور کوئی شبہ نہیں کہ ؎

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ انھیں

لیکن اس وقت کچھ باتیں ان کی ذات کے بارے میں بھی لکھنا بے محل نہ ہو گا۔ ۱۹۵۱ سے ۱۹۶۸ تک مجھے درجنوں بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ جتنا ہم ان کے علم سے مرعوب تھے' اتنا ہی انھوں نے اپنی محبت' شفقت اور بے تکلفی سے ہمیں اپنے سے مانوس کر لیا تھا۔ جمعیت کے زمانے میں وہ ہم سے اپنی اولاد کی طرح معاملہ کرتے۔ بڑے چھوٹے کا ذرا فرق نہ کرتے۔ ہم سے کھل کر بات کرتے۔ ضرورت پڑے تو بلاتکلف سرزنش بھی فرماتے لیکن ایسی اپنائیت کی فضا میں بات کرتے اور اتنا بے تکلف ہو جاتے کہ ہم اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتے۔ خرم' ظفر اسحاق' اسرار اور مجھ سے غیر معمولی شفقت فرماتے اور بڑی قدر افزائی کرتے۔ وہ ہفت روزہ اسٹوڈنٹس وائس کا شوق سے مطالعہ کرتے اور ہمارے تصویریں چھاپنے سے درگزر فرماتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مولانا ظفر احمد انصاری کے مکان پر ایک دعوت کے موقع پر' جس میں اخوان کے رہنما شیخ صالح عشماوی بھی شریک تھے' جب فوٹو کی نوبت آئی تو مولانا اصلاحی کچھ مضطرب ہوئے۔ جب انصاری صاحب اور میں نے درخواست کی کہ آپ بھی شریک ہو جائیں تو کچھ توقف کے بعد کرسی پر بیٹھ گئے اور آنکھیں نیچی رکھیں۔ غالباً ہمارا دل رکھنے کے لیے!

دل رکھنے پر یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اخوان رہنماؤں کے ساتھ مولانا علی میاں بھی شریک تھے اور سب نے مغرب اور عشا کی نماز جمع کی۔ مولانا علی میاں بھی شریک ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے ادب سے پوچھا کہ مولانا میں تو اتنا پکا حنفی نہیں ہوں اور سفر میں بالعموم جمع بین الصلوتین پر عمل کرتا ہوں لیکن آپ کے شریک ہونے سے ہمت ہو رہی ہے کہ آپ کی رائے معلوم کروں۔ مولانا

مسکرائے اور فرمایا: مسلک تو میرا وہی ہے جو احناف کا معروف مسلک ہے لیکن خیال خاطر احباب میں اور کسی اختلافی صورت سے بچنے کے لیے شریک ہو جاتا ہوں مگر نیت نفل کی کر لیتا ہوں تاکہ لوگ محسوس نہ کریں۔ مولانا علی میاں ہی نے حضرت یحییٰ منیری کے بارے میں لکھا ہے: نفلی روزے سے تھے، ایک مرید حلوہ لایا اور اصرار کیا کہ حضرت، ضرور کچھ تناول فرمائیں۔ تھوڑے توقف کے بعد انھوں نے حلوہ کھا لیا۔ بعد میں جب دوسرے افراد نے پوچھا کہ حضرت، آپ نے روزے میں حلوہ کیسے کھا لیا تو کیا خوبصورت جواب دیا: نفلی روزہ توڑنے کی قضا ہے لیکن ایک چاہنے والے کا دل توڑنے کی قضا نہیں۔ سبحان اللہ! ہمارے بزرگوں نے محبت اور شفقت کی کیسی مثالیں قائم کی ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ مسلمان، مسلمان کا گلا کاٹ رہا ہے!

مولانا اصلاحی صرف ایک بلند پایہ مفکر اور ایک صاحب طرز ادیب ہی نہیں، ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ میں نے ان کی بے شمار تقریریں سنی ہیں لیکن سب سے گہرا نقش ان کی اس مسحور کن تقریر کا رہا جو کراچی کے اجتماع میں انھوں نے درد سر کی حالت میں کی اور جس میں بیان کیا گیا تھا کہ "ہم اس ملک میں کیا تغیرات لانا چاہتے ہیں"۔ مولانا مودودی کی تقریر اگر میدانی علاقے میں بہنے والے دریا کی مانند تھی جس میں روانی کے ساتھ ٹھہراؤ تھا تو مولانا اصلاحی کی تقریر اس پہاڑی نالے کی مانند ہوتی تھی جو پوری رفتار کے ساتھ پتھروں کو اپنے جلو میں بہاتے ہوئے اپنا سفر طے کر رہا ہو اور جس میں روانی کے ساتھ تلاطم اور آبشاروں کا ترنم بھی موجود ہو۔

مولانا اصلاحی کی تقریر ہو یا تحریر، صحت فکر کے ساتھ حسن بیان بھی اس کا ایک مسحور کن خاصہ ہے۔ مجھے ان کی تحریر میں شبلی کی ادبیت، مولانا مودودی کی فکری گہرائی اور سلاست اور ابو الکلام آزاد کی خطابت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ جہاں وہ ٹھوس دلائل اور محکم تحقیق کے بادشاہ تھے وہیں وہ ایک اعلیٰ انشا پرداز اور شگفتہ بیان ادیب اور مقرر تھے۔ ان کے اسلوب میں ایک منفرد شوخی اور بانکپن ہے جس میں قرآن اور بائبل دونوں کے ادب کا پرتو نظر آتا ہے۔

مولانا اصلاحی کی تحریر اور تقریر، بلکہ مجلسی گفتگو میں بھی بلا کی شوخی اور حسب ضرورت طنز کی کاٹ پائی جاتی تھی۔ پاکستانی عورت دوراہے پر (جو اب اسلام میں عورت کے مقام کے نام سے شائع ہوئی ہے) میں حکومت اور کلچر کے کارپردازوں کے بیانات پر ان کی تنقید اس نوعیت کے ادب کا شاہکار ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے "حاکمیت الٰہی یا حاکمیت جمہور" والے مضمون پر اور مولانا منظور نعمانی کے "جماعت اسلامی پر الزامات اور ان کا جواب" اور "نئی فرد جرم" پر تنقید و احتساب صرف علمی مباحث کا مرقع ہی نہیں، ادب و انشا اور طنز کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں۔

بیان کی یہ شوخی مولانا اصلاحی کی طبیعت کا ایک خاص پہلو ہے۔ ان کے اسلوب میں بلا کی بے ساختگی ہے اور اتنے معصوم انداز میں ایسی دلچسپ بات کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا لطف لیتا رہ جاتا ہے۔ جمعیت کے دور کی ایک تربیت گاہ میں کچھ نوجوانوں کو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دیکھ کر فرمایا کہ "آپ لوگ ایسے پھل تو نہ بن جائیں جو پکنے سے پہلے ہی سڑ جاتے ہیں"۔ گویا تلقین فرمائی کہ اس دور میں شوخی اور شرارت بھی زندگی کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح سنجیدہ بحث! ایک موقع پر یہ مصرع پڑھا:

ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

میں نے تنہائی میں اس کا دوسرا مصرع پوچھا تو فرمایا: کیا کریں گے آپ جان کر۔ اس وقت یہی مصرع آپ لوگوں کے لیے کافی ہے۔ بعد میں اس کا پہلا مصرع بھی مجھے معلوم ہو گیا اور یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ مولانا نے صرف ایک ہی مصرع کیوں استعمال فرمایا۔

ایک مرتبہ کراچی میں مولانا اصلاحی سے دیر تک ذاتی معاملات پر بات ہوتی رہی۔ میں نے بے تکلفی کے اس ماحول میں ان باتوں کا ذکر کیا جو میں نے اپنے والد سے سنی تھیں۔ ان میں یہ واقعہ بھی تھا کہ جب مولانا اصلاحی کی دوسری شادی ہوئی تو برات کا قیام ہماری ہی خاندانی حویلی میں ہوا تھا جو راہوں' جالندھر میں تھی اور جہاں مولانا مسعود عالم ندوی" کی نگرانی میں دارالعروبہ کام کر رہا تھا۔ اس حویلی کو شیش محل کہتے تھے۔ جناب چودھری عبدالرحمن کی حویلی کے بالکل بالمقابل واقع تھی جن کی صاحبزادی سے مولانا اصلاحی کا رشتہ ہوا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ جب میں لاہور آیا اور مولانا سے ملا تو بڑا لطف لے کر فرمایا کہ آپ نے تو مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا۔ میں پریشان ہوا کہ ایسی کیا غلطی ہو گئی ہے۔ فرمانے لگے کہ آپ نے جو باتیں مجھے کراچی میں بتائی تھیں میں نے ان کا ذکر اپنے گھر میں کیا۔ پھر تو سوالات کی بارش ہو گئی۔ تم نے یہ کیوں نہ پوچھا اور فلاں اب کس حالت میں ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے مخاطب کر کے فرمایا: آپ کو پتہ ہے میں نے کیا کہا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ 'نیک بخت' میں کوئی عورت نہیں ہوں کہ اتنے سوال کر ڈالتا۔ جب خورشید میاں لاہور آئیں گے تو تم خود پوچھ لینا۔ مزید فرمایا: اب آپ گھر آئیں اور خود بھگتیں! ضمنی طور پر عرض کر دوں کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں ازراہ شفقت مجھے خورشید میاں کہا کرتے تھے' خورشید صاحب یا پروفیسر صاحب نہیں۔ والدین کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہی دو بزرگ تھے جن کی زبان یا قلم سے "خورشید میاں" سن کر یا پڑھ کر ایک سرور محسوس ہوتا تھا۔ افسوس اب اس طرح پکارنے والا کوئی اور نہ رہا اور اس پر ستم یہ کہ اب تو ہمارا بھی شمار یکے از بزرگان ہونے لگا!

ایک واقعہ اور سنایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی سے مولانا اصلاحی کی بڑی بے تکلفی تھی۔ البتہ تصوف اور بیعت وغیرہ کے مسئلہ پر دونوں میں بڑا اختلاف تھا۔ جب ندوی صاحب نے حکیم الامت مولانا اشرف علی

تھانوی سے بیعت کی تو اس کے بعد ملاقات میں خاصی نوک جھونک رہی۔ فرمانے لگے کہ جب سید صاحب نے مجھ سے یہ اصرار کیا کہ تم بھی سنجیدگی سے بیعت کے بارے میں سوچو تو میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ "آپ ہاتھ اٹھائیں اور میں بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں کہ اے میرے رب! جب میری یہ حالت ہو جائے کہ میں اپنی عقل کی باگیں کسی اور کے ہاتھ میں دے دوں تو اس سے پہلے مجھے اٹھا لیجیو"۔ کہنے لگے کہ سلیمان ندوی دم بخود ہو گئے اور پھر کبھی اس مسئلے پر بات نہ ہوئی--- یہ واقعات مولانا اصلاحی کی شخصیت کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں جس کا تعلق بیک وقت عزت نفس' خود اعتمادی اور طبیعت کی شوخی سے ہے۔

اصلاحی صاحب کی زندگی کا ایک اور پہلو ان کی سادگی اور قناعت ہے۔ انھوں نے دنیا کی کبھی طلب نہیں کی۔ جب دنیا دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے گئی تب بھی انھوں نے دنیا کو گھاس نہیں ڈالی۔ نہایت سادہ انداز میں زندگی گزاری۔ ضروریات کو محدود رکھا۔ جو مل گیا اس پر گزارہ کیا۔ رحمان پورہ' لاہور میں جہاں وہ اس زمانے میں مقیم تھے' بارہا ان کے گھر جانے کا موقع ملا اور ہمیشہ ان کی سادہ زندگی پر رشک آیا۔ روایت ہے کہ جب شیخوپورہ میں اپنی اہلیہ کے زرعی فارم (رحمان آباد) منتقل ہو گئے' جہاں تدبر قرآن کی تحریر تسوید کا بیشتر کام ہوا۔ یہاں بجلی کی سہولت بھی نہ تھی لیکن مولانا اصلاحی کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے اور اپنی دھن میں لگے رہے۔

دنیا اسیر ہے مرے دام خیال میں
اے بے خبر مقید دنیا نہیں ہوں میں

سادگی اور قناعت اپنی جگہ لیکن مولانا کی زندگی میں بلا کی شائستگی' نفاست اور سلیقہ تھا۔ لباس' غذا' گفتگو' تحریر' ہر چیز صاف ستھری--- گویا زندگی ایک آرٹ ہے جس میں سادگی تو ہے لیکن سلیقہ اور تزئین کی کمی نہیں۔ روایت ہے کہ مولانا اپنے استعمال کی چیزوں کے بارے میں بھی سخت موحد تھے اور اپنے ہی گھر میں ان کی ایک جداگانہ دنیا تھی جس میں کسی دوسرے کو دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی۔ گویا اس معاملے میں ان کا مزاج کچھ اکبر بادشاہ جیسا تھا' جس نے ہاتھی پر بیٹھنے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ اس کا کنٹرول فیل بان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ نوجوان بادشاہ نے کہا تھا کہ جس سواری کی لگام میرے ہاتھ میں نہ ہو' میں اس پر سواری نہیں کرتا۔ مولانا بھی اپنی ایک جداگانہ مملکت رکھتے تھے اور اس میں زمام کار ان کے اپنے ہاتھوں میں رہتی تھی۔ جس طرح وہ عقل کی باگ کسی دوسرے کو سونپنے پر راضی نہ تھے اسی طرح نجی اور شخصی معاملات میں بھی شرکت گوارا نہیں کرتے تھے اور نہ کسی پر بوجھ بننے کو تیار تھے۔

مولانا اصلاحی کی زندگی میں عقل و ارادہ اور خودی اور عزت نفس کے باوجود دل اور دماغ کا بڑا حسین

امتزاج تھا۔ نہ اتنے روکھے کہ بس عقل ہی کے اشارے پر چلتے رہیں اور دل زندہ کے تقاضوں اور مطالبوں کو یکسر نظرانداز کر دیں' نہ اتنے نرم کہ باگ' دل کو تھما دیں اور عقل و خرد کے تقاضوں کو فراموش کر دیں۔ نرمی اور سختی' جرات و بے باکی اور رحمت و التفات' احتساب و سرزنش اور عفو و درگزر کے دھارے ساتھ ساتھ بہتے تھے گویا اس شعر کی نظیر!

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یہی وجہ ہے کہ جہاں دلوں پر مولانا اصلاحی کے علم اور ان کے مقام کا رعب ہے وہیں ان کی مشفقانہ اور پیار بھری شخصیت سے محبت اور ان کی طرف گہری کشش سے ان سے تعلق کی امتیازی نشان عبارت ہے۔ مولانا نے صرف فکر کے چراغ ہی نہیں جلائے انھوں نے شفقت اور محبت کے دیے بھی روشن کیے۔ ان کے افکار اور ان کی تعلیم و تربیت کے اثرات ایک نہیں کئی نسلوں پر ہیں۔ وہ اپنے پیچھے ایک مدت تک زندہ رہنے والی کتابوں ہی کا سرمایہ نہیں چھوڑ گئے بلکہ مختلف سطح پر ایسے شاگرد اور معنوی ذریت بھی چھوڑی ہے جو اس کام کو جاری رکھے گی جس کی صورت گری انھوں نے اپنے خون جگر سے کی۔ اگر ایک طرف اسلامی تحریکات ان کی وارث ہیں تو دوسری طرف انھوں نے ایسے شاگرد بھی چھوڑے ہیں جو پاکستان اور بیرون پاکستان ان کے قائم کردہ کاموں کو ان شاء اللہ جاری رکھیں گے۔ توقع ہے اسی سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

مولانا اصلاحی ہم سے رخصت ہو گئے لیکن مولانا اصلاحی ہمیں وہ کچھ دے گئے کہ ان شاء اللہ جس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی جوانی اور اپنا بڑھاپا تج دیا' وہ مشن زندہ اور تابندہ رہے گا اور اللہ کے بندے اس نور سے مدتوں فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک صدقہ جاریہ ہے جس کا اجر ان شاء اللہ ان تمام بزرگوں کو ملتا رہے گا جنھیں اس صدی میں اسلامی فکر کی تشکیل اور اسلامی احیا کی تحریک کو قائم کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے' ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے' ان کے روشن کردہ چراغوں کو ہمیشہ ضوفشاں رکھے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند اور غالب ہو اور امت ہی نہیں' پوری انسانیت کی رہنمائی کا سلسلہ جاری و ساری رہے۔ ؎

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

اہم گزارش : ترجمان القرآن میں اشتہار دینے والے اداروں یا افراد سے معاملات میں کوئی نقصان ہو تو ترجمان القرآن کے نمایندے اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ قارئین کو چاہیے کہ کوئی معاملہ کرنے سے پہلے تحقیقات کریں اور اپنی ذمہ داری پر معاملہ کریں۔